ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

ماخذ تحقیقی مجلہ

OPEN ACCESS

CC BY NC

سجید خان

پی ایچ ڈی اسکالر شعبہ اردو جامعہ پشاور

ڈاکٹر ولی محمد

لیکچرار شعبہ اردو جامعہ پشاور

سماجی مقررات کے تناظر میں محمد طفیل کے خاکوں میں موضوع شخصیات کا تجزیہ

(چودھری نذیر احمد، میرزا ادیب اور سید وقار عظیم کے خصوصی مطالعے کی روشنی میں)

Sajeed Khan*
PhD Research Scholar, Department of Urdu, University of Peshawar.
Dr Wali Muhammad
Lecturer, Department of Urdu, University of Peshawar.
***Corresponding Author:**

An Analytical Study of the Portrayal of Personalities in Muhammad Tufail's Sketches in the Context of Social Norms

(Special Reference to Chaudhry Nazir Ahmad, Mirza Adeeb, and Syed Waqar Azeem)

One of the prominent qualities of the character sketches written by Muhammad Tufail is the presentation of culture within these sketches. A total of six collections of his sketches—Sahib, Janab, Aap, Mo'azzam, Muhibbi, and Makhdumi—have been published. His book Muhibbi includes sketches written with reference to Chaudhry Nazir Ahmad, Mirza Adeeb, and Syed Waqar Azeem. In these sketches as well, Muhammad Tufail has effectively portrayed social norms in relation to these three subject personalities. In this research article, the researchers present a reasoned and analytical examination of the nature and quality of social norms as reflected through these personalities in Muhammad Tufail's sketches.

Key Words: *Muhammad Tufail, Muhibbi, sketches, Chaudhry Nazir Ahmad, Mirza Adeeb, Syed Waqar Azeem, Social Norms, Analysis.*

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05
ماخذ تحقیقی مجلہ

اقدار اور عقائد وہ بنیادیں فراہم کرتے ہیں جس پر سماجی مقررات کو قدم رکھنے کے لیے اخلاقی یا ثقافتی جواز مل جاتا ہے۔ اقدار یا عقیدے کی جڑیں گہری ہوتی ہیں، سماجی مقررات ان کے ساتھ معنوی رشتہ قائم کرنے اور انہیں اعمال کے ساتھ مربوط کرنے کے کام آتے ہیں۔ سماجی مقررات سماجی اقدار کے مقابلے میں زیادہ شدید اور واضح صورت رکھتے ہیں۔ سماجی مقررات ہی کسی عمل کے مثبت اور منفی، قابل قبول اور ناقابل قبول ہونے کے متعلق فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ سماجی مقررات میں واضح فیصلہ اور عمل کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا اقدار کے مقابلے میں عملی بنیاد ان کی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی مقررات کو سماج کے غیر تحریر شدہ قوانین بھی کہا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

> Social norms are the unwritten rules of behavior that are based on shared values. These norms dictate how people are expected to behave in various situations.(۱)

یہ سماجی مقررات ہی ہمیں بتاتے ہیں کہ مخصوص حالات میں کون سے عمل یا رد عمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ہر سماجی عمل اور رد عمل کے پس منظر میں سماجی اقدار اور عقائد کا پیچیدہ نظام کارفرما ہوتا ہے۔ محمد طفیل کے خاکوں میں جو موضوع شخصیات موجود ہیں وہ ایک ایسے دور سے متعلق ہیں جب سماج میں معنوی اور اخلاقی اعتبار سے سماجی اقدار اور سماجی مقررات کی اہمیت تھی اور لوگ ان کا خیال رکھتے تھے۔ ان خاکوں میں موضوع شخصیات پچھلی صدی کے علم و دانش اور سماجی وجود کے جیتے جاگتے نمونے ہیں۔ ان میں سے ہر شخصیت درجن بھر کتابوں یا فن پاروں کی خالق ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے کافی متحرک اور بامعنی زندگی گزاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خاکوں میں موضوع شخصیات کے اعمال اور افکار میں سماجی مقررات کا رس صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ شخصیات ہندوستان کے طول و عرض سے تعلق رکھتی ہیں۔ خاندانی پس منظر، ذاتی زندگی، منفرد عملی تجربات، افکار، نظریات اور روحانی بنیادوں کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود ایک معیار کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محمد طفیل نے ہر شخصیت کو اپنے خاکوں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ جس میں انہیں کچھ نظر آیا اور جن کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، ان پر انہوں نے قلم اٹھانے کی سعی کی ہے۔ آیئے ان خاکوں کی رو سے مذکورہ موضوع شخصیات کے اعمال و افکار کی روشنی میں سماجی مقررات کے وجود کی نشاندہی اور ان کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

ماخذ تحقیقی مجلہ

چودھری نذیر احمد:

ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں کام کے لوگ کم اور دستار کے خواہشمند زیادہ ہیں۔ نہ صرف یہ کہ خواہشمند بلکہ بہت سے تو اس زعمِ باطل میں گرفتار ہوتے ہیں کہ دستار کے اصل حقدار وہی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ جب زمانہ خود ان کے سر پر دستار نہیں رکھتا تو ایسے لوگ زمانے کی ناقدری کا رونا روتے ہیں ۔زمانے کی ناقدری کا رونا دستار کے حقدار لوگ بھی روتے آئے ہیں۔ وہ بھی زمانے کی سنگدلی کا ایک اور رخ ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر دور میں ایسے بالشتیے ضرور ہوتے ہیں کہ وہ دستار کے حصول کی خاطر ہر جائز و ناجائز عمل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور وقتی طور پر ہی سہی لیکن سر پر دستار سجا بھی لیتے ہیں۔ محمد طفیل نے ان خاکوں میں خود کو مختلف مقامات پر موضوع شخصیات کے سامنے رکھا ہے۔ وہ کسی بھی موضوع شخصیت پر بات کرتے ہوئے خود کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور یہ ان کے خاکوں کی بنیادی کمزوری بھی ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے انہوں نے بعض مقامات پر بڑی کام کی باتیں کی ہیں۔ مثلاً چودھری نذیر احمد پر تحریر کردہ خاکے میں انہوں نے بتایا ہے کہ میں چھوٹے دل کا مالک ہوں اور ان کی تعریف کروں گا تو مجھے تکلیف ہو گی۔ وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یوں دل دہلے گا جیسے وہ مر کر بھی میرے سر سے فضیلت کی کلغی اتار لیں گے۔ کلغی اترنے کا احساس ہمیشہ انہیں ہوتا ہے جن کے سر پر کلغی ہوتی ہی نہیں۔"[۲]

محمد طفیل صاحب نے اس بیان میں چودھری نذیر احمد کے مقابلے میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے پبلشنگ اور ادارت کی دنیا میں خود کو چودھری نذیر احمد کے مقابلے میں رکھا ہے۔ اور تمام خاکے میں خود کو ان کے مقابلے میں کمتر ثابت کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار کرتے کرتے بھی انہوں نے سماج میں ایسے کرداروں کی ڈھکے چھپے انداز میں نشاندہی ضرور کی ہے جو دستار کے قابل نہیں ہوتے لیکن خود کو دستار کے قابل سمجھتے ہیں اور ان کو دستار چھن جانے کا خوف اس لیے کہ دامنگیر رہتا ہے کہ دراصل دستار ان کے سر پر ہوتی ہی نہیں۔ کلغی یا دستار کے ساتھ سماجی مقررات وابستہ ہیں۔ میر تقی میر نے کہا تھا:

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار[۳]

بات جب بھی دستار کے چھننے تک آتی ہے تو آدمی لڑنے بھڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

ماخذ تحقیقی مجلہ

ادیبوں کی زندگی میں ایسی اقدار ملتی ہیں جن کا عملی اطلاق اگر سماج پر ہو جائے تو سماج سے مذہبی انتہاپسندی اور فرقہ ورانہ منافرت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو سکتا ہے۔ سماج میں ایسے مقررات موجود ہوتے ہیں جن کا خاتمہ انسان دوستانہ رویوں کے نتیجے میں کیا جاسکتا ہے یا جن کی شدت کم ضرور کی جاسکتی ہے۔ منفی سماجی مقررات کے خلاف جہاد کا فریضہ ادیب ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ مذہبی لوگوں کی مجبوریاں ہوتی ہیں، وہ اگر چاہیں بھی تو کچھ عقائد یا تصورات کا خاتمہ نہیں کرسکتے بلکہ ان کی شدت کم کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوتے۔ مثلاً ہر ایک مذہب میں حرام اور حلال کا سلسلہ موجود ہے۔ ہندومت اور اسلام میں بھی کھانے کے حوالے سے حرام اور حلال کی فہرست موجود ہے۔ ہندومت میں گوشت کھانا اور بالخصوص گائے کا گوشت کھانا حرام ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں خنزیر کا گوشت حرام ہے۔ اور اس کے علاوہ اور بھی جانور یا پرندے ہیں جن کا گوشت کھانا حرام سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی ہندو گوشت کھائے یا مسلمان خنزیر کا گوشت کھائے یا شراب پی لے تو اس حوالے سے سخت سماجی ردعمل سامنے آتا ہے۔ انفرادی سطح پر ان کاموں اپنے اپنے مذہبی تناظر میں انتہائی منفی اور برا تصور کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں کرشن چندر کافی زیادہ انسان دوست اور روشن خیال واقع ہوئے تھے۔ مصنف کے بقول کرشن چندر ایسے کھانا کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے جو ہندومت کی روشنی میں حرام تصور کیا جائے۔ جب ان سے پوچھا جاتا تو وہ کہتے:

> ”میرا نام ہندوؤں والا ہے مگر میں ہندو نہیں ہوں۔ اگر میرا نام مسلمانوں والا ہوتا تو میں مسلمان بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ میرا مذہب تو انسانیت ہے۔“ (۴)

روشن خیالی اور مذہبی رواداری کی ایسی مثال سماج میں بہ مشکل تلاش کی جاسکتی ہے۔ لیکن سماج کی روحانی فلاح اور سماجی اور سیاسی بہبود کا راستہ مذہبی رواداری سے ہو کر جاتا ہے۔ فرقہ ورانہ یا مذہبی منافرت سماج میں خوف پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں اور ایک ایسی فضا کی تشکیل کرتے ہیں جس میں سانس لینا بھی محال ہوجاتا ہے۔ سماجی مذہبی نوعیت کے سخت گیر مقررات کے سامنے ادیب ہی دلیل اور انسان دوستی کو ڈھال بنا کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

بے تکلف دوستی میں کئی ایک مقررات کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً ایک عام سماجی مقررہ یہ ہے کہ کسی کی جیب میں ہاتھ ڈالنے اور اس سے پیسے نکالنے کو معاشرے میں انتہائی برا عمل تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن مصنف نے کرشن چندر کا حوالہ دیا ہے کہ ان کے بقول وہ چودھری نذیر احمد صاحب کی جیب میں ہاتھ ڈال کر

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05
ماخذ تحقیقی مجلہ

ریوڑیاں کھانے کے لیے پیسے نکال لیا کرتے تھے اور وہ میرا ہاتھ نہ روکتے تھے۔ البتہ اتنا کہتے کہ ریاض کی امی نے ایک چیز کی فرمائش کر رکھی ہے۔ اس کے لیے پیسے چھوڑ دینا۔ تا کہ میں اس کے لیے وہ چیز خرید سکوں۔[۵]

ایسی صورت میں کسی دیرینہ دوست کو اس عمل یا اس سے مماثل عمل سے روکنے کی صورت میں بے تکلفی تکلف میں بدل جایا کرتی ہے اور دوستی محض رسمی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح یہ چودھری نذیر احمد کی شخصی عظمت ہے کہ وہ اپنے دوست کرشن چندر کا ہاتھ نہیں روکتے ورنہ بالعموم گہرے دوستوں کے مابین بھی بعض اوقات ایسی ہی باتوں پر تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہیں۔ یہ بات چودھری نذیر احمد کی اعلیٰ ظرفی پر دلالت کرتی ہے۔ کرشن چندر کے بقول جب میں چودھری نذیر احمد سے کہتا کہ تمہاری جیب میں تو کل ایک روپیہ اور دو آنے ہیں۔ تو وہ جواب میں کہتے کہ ایک روپیہ چھوڑ دے اور دو آنے لے لے۔ تا کہ تمہاری بھابی بھی ناراض نہ ہو۔[۶]

دوستی اور بھائی چارے کے اس ماحول میں رواداری اور اعلیٰ ظرفی ہی وہ قوت ہے جس نے انہیں آپس میں جوڑ کر رکھا ہوا ہے۔ چودھری نذیر احمد کی زندگی مثبت مقررات کی پاسداری میں گزری۔ مثلاً منٹو نے افسانہ موذیل لکھا۔ اور مصنف کو اس وجہ سے دیا کہ اس سے پہلے وہ دو افسانے نقوش کے لیے لکھ چکا تھا اور مصنف کو پسند نہ آئے تھے۔ منٹو نے محض دکھانے کے لیے دیا۔ اس لیے کہ وہ افسانہ اس نے چودھری نذیر احمد کے لیے لکھا تھا اور اس کے لیے چودھری نذیر احمد کے بقول اس نے منٹو کو اپنے خرچ پر چھ بوتلیں پلائی تھیں۔ مصنف کے بقول چودھری نذیر احمد کی موجودگی میں ان سے وہ افسانہ واپس لینا چاہا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پھر منٹو کا فن گزشتہ دو افسانوں کی بنیاد پر رہے گا۔ منٹو چودھری صاحب کو لے گئے اور افسانہ رہ گیا۔ مصنف کے بقول مجھے ان کا اس طرح لے جانا اچھا نہیں لگا۔ اس وجہ سے اگلے ہی دن میں وہ افسانہ چودھری صاحب کے پاس لے گیا اور کہا کہ افسانہ حاضر ہے۔ چودھری صاحب نے جواب میں کہا:

> ”یہ افسانہ مجھے بڑا عزیز ہے۔ اس افسانے کی خاطر آٹھ دس دن تک ان کے ساتھ گھومتا رہا۔ چھ بوتلیں اپنی گرہ سے پلائیں۔ مگر اب اسے تو ہی چھاپ لے۔ میں پھر دریا میں جال ڈال کر بیٹھ جاؤں گا۔“[۷]

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

منٹو کا وہ افسانہ جس پر چودھری صاحب کا اخلاقی اعتبار سے حق تھا اور افسانہ خود ان کی میز تک پہنچا۔ اس کے باجود انہوں نے مروتاً واپس لینے سے انکار کر دیا۔ کسی کے حق پر اس انداز سے ڈاکہ برا لگتا ہے۔ لیکن چودھری صاحب بڑے دل کے مالک انسان تھے۔

پاکستانی معاشرہ شروع دن سے ہی سماجی اور سیاسی جبر کا شکار ہے۔ یہاں پر ان تمام آوازوں کو دبانے اور بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی جو نئے افکار اور نئے سماجی اور سیاسی ڈھانچے کے لیے بنیاد فراہم کر سکتی تھی۔ آزادی اظہار پر پابندی صرف ریاستی مشینری کا استعمال کرنے نہ تھی بلکہ ریاست نے سماجی ڈھانچے کو بھی اس میں بڑے گھناؤنے انداز میں استعمال کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسی اٹھنے والی آوازوں کو ریاست اور سماج دونوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چودھری صاحب نے ان سب کا سامنا انقلابی کی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ ذمہ دار ناشر کی حیثیت سے کیا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے منٹو کے متنازعہ افسانے چھاپے جن کو کوئی اور چھاپنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ عصمت چغتائی کا افسانہ ''لحاف'' شائع کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کے افسانے اور دیگر کتب شائع کیں۔ مصنف کے بقول انہوں نے اپنے انٹرویو میں اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ اس لیے نہیں کیا کہ وہ اشتراکی تھے، بلکہ محض اس وجہ سے کیا کہ وہ ایک ذمہ دار ناشر تھے اور ان کی خواہش تھی بہترین مصنفین کی کتب شائع کی جائیں۔ وہ اپنے آپ کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ اس زمانے میں بہترین لکھنے والے اشتراکیت بگوش تھے۔ کتابوں کے ساتھ عشق میں ان کے بقول ان کی گرفتاریاں ہوئیں، گھر پر چھاپے پڑے اور بدنامیاں ہوئیں۔[۸]

گرفتاریاں اور چھاپے ریاستی جبر جبکہ بدنامیاں سماجی جبر کا نتیجہ تھیں۔ چودھری صاحب جیسی شخصیات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج سماجی جبر کی انتہا کے باوجود بھی انسان کے آبرومندانہ خواب زندہ ہیں اور ان کی گونج سنی جاسکتی ہے۔ سماجی جبر کے خلاف لڑنا اور ان آوازوں کو مرنے نہ دینے میں ذلتیں اور صعوبتیں برداشت کرنا، یہ چودھری صاحب کی بہت بڑی خدمت ہے۔

معاشرے کی روحانی بنیاد جن مقررات پر استوار ہوتی ہے وہ غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ مشرق اور بالخصوص ہندوستانی معاشرے میں بڑوں کے ادب اور احترام سے وابستہ مقررات کا سلسلہ موجود ہے۔ ان میں سے ایک مقررہ یہ بھی ہے کہ دورانِ گفتگو حفظِ مراتب کا خیال رکھا جائے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو مصنف نے چودھری نذیر احمد کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ حفظِ مراتب کا خیال رکھتے تھے۔[۹] اس کے علاوہ تعلقات کی نوعیت بالعموم دو قسم کی ہوتی ہے۔ پر تکلفانہ اور بے تکلفانہ۔۔۔ بے تکلفانہ قسم کے تعلق میں گفتگو کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ ایسے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05
ماخذ تحقیقی مجلہ

تعلق میں انسان فطری رہتا ہے۔ چودھری نذیر احمد تعلقات کی ان دونوں نوعیتوں سے واقف تھے۔ مصنف کے بقول:

> ”جن سے بے تکلف نہ تھے ان کے لیے بقراط تھے۔یعنی جیسی محفل ویسی بولی ٹھولی۔ کبھی لکھنوی تکلف ہی تکلف، کبھی پنجابی دریا دلی ہی دریا دلی۔“(۱۰)

میرزاادیب:

محمد طفیل کے خاکوں میں موضوع شخصیات کا ذکر محض ان پر لکھے ہوئے خاکے میں نظر نہیں آتا بلکہ دیگر خاکوں میں بھی موقع و محل کی مناسبت سے آتا رہتا ہے۔ مثلاً مرزاادیب پر تحریر کردہ خاکے میں ان کی شرافت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو کا بھی ذکر آیا ہے۔ منٹو کی شخصیت میں مذہبی حوالے سے روشن خیالی موجود تھی، وہ منہ پھٹ بھی تھے اور شراب نوش بھی۔ یہ تینوں باتیں سماجی مقررات سے متصادم ہیں۔ مصنف نے بڑے اشاراتی انداز میں ان باتوں کا ذکر کیا ہے تاکہ ان کا اثر کم ہو سکے۔ لکھتے ہیں:

> ”وہ وضو کا اخلاقاً قائل تھا، اشنان کا عادتاً،وہ ترسنے کا قائل نہ تھا۔ڈوب جانا اس کے مزاج کا خاصا تھا۔ وہ شریف آدمی بھی تھا، وہ مد بھائی بھی تھا۔“(۱۱)

دیکھا جائے تو ایسی صورتحال میں منٹو کی جو شخصیت بنتی ہے وہ سماج کے مقرر کردہ دائرے میں فٹ نہیں آتی۔ اس لیے کہ ان کا مادی اور روحانی وجود سماج کے مقررات کے ساتھ تصادم کی کیفیت میں ہے۔

پدرسری سماج میں بیگم سے ڈرنے کو کافی زیادہ برا سمجھا جاتا ہے۔ اس سماج کی بنیادیں مرد کی بالادستی پر استوار ہیں۔ ایسے حالات میں شوہر کا تصور یہ ہے کہ اسے بیوی کے معاملے میں سخت گیر ہونا چاہیے۔ یہ سخت گیری حساس اور شریف قسم کے انسانوں کے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔ مرزا ادیب کا معاملہ بھی کچھ اس قسم کا تھا۔ مثلاً ان کے حوالے سے یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں۔ مصنف کے بقول بیوی نے اس سے پوچھا کہ یہ تم کیا میرے متعلق پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہو۔ جس کے جواب میں مرزاادیب نے کہا:

> ”عجو کی ماں! میں کوئی آپ سے ڈرتا ہوں، جو لوگوں سے کہوں گا کہ ڈرتا ہوں۔“(۱۲)

پدرسری سماج میں بیوی کا جو روایتی تصور ہے اس کی روشنی میں بیوی خدمت کے لیے اور مرد کمانے کے لیے ہے۔ بیوی کے معاملے میں زیادہ تابعداری یا محبت کا اظہار سماج کی ظاہری سطح پر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی سے ان مقررات کی شدت میں کمی آرہی ہے، لیکن سماج میں آج بھی زن مرید کو

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

ماخذ تحقیقی مجلہ

طعنے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور یہی طعنہ مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ مناسب محبت کے اظہار سے بھی روکتا ہے۔ مرزا ادیب پدرسری سماج کے ان مقررات کی کچھ زیادہ پرواہ کرنے والے نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی بیوی کے ساتھ ان کی بے پناہ محبت تھی اور اس کا اظہار ان دنوں کافی شدت کے ساتھ ہوا جب ان کی بیوی بیمار تھی۔ مصنف کے بقول انہوں نے پچیس پچیس گھنٹے تیمارداری کی۔ چوبیس گھنٹے سب کے سامنے اور ایک دو گھنٹے عالم خیال میں اور خود بیمار نظر آنے لگے۔[۱۳]

ان کی مسلسل خدمت، تیمارداری اور محبت کا نتیجہ تھا کہ ان کی بیگم صحت یاب ہو گئیں۔ دیکھا جائے تو پدرسری سماج میں اپنی بیوی کے لیے اتنی پریشانی اور ان کی اس قدر خدمت اور تیمارداری ان کے انسان دوستانہ اور دردمندانہ اور محبت بھرے معصوم دل کو ظاہر کرتا ہے۔ پریشانی کی جس سطح کی نشاندہی محمد طفیل نے کی ہے وہ غیر معمولی ہے اور ان کی شرافت پر دلالت کرتی ہے۔

وعدہ کو نبھانا بھی ہمارے سماج کا ایک اہم مقررہ ہے۔ اسلام کی رو سے بھی عہد کی پاسداری کی تاکید کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وعدہ خلاف آدمی کا شخصی وقار اور اعتبار خاک میں مل جاتا ہے اور معاشرے کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ مرزا ادیب بھی وعدہ نبھانے کے انتہائی سختی سے پابند تھے۔ مصنف کے خیال میں وہ کیا گیا وعدہ ضرور پورا کریں گے چاہے اس کے لیے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑے۔[۱۴] اس ضمن میں انہوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ میں نے ان سے نقوش کے لیے مضمون مانگا تو انہوں نے ایک ہفتے میں دینے کا وعدہ کیا۔ آخری دن مارشل لا کی وجہ سے لاہور میں کرفیو لگا تھا۔ صرف چند گھنٹوں کے لیے چھوٹ مل جاتی تھی۔ مرزا ادیب نے اس سے فائدہ اٹھایا اور مضمون لے آئے۔ مصنف نے جب کہا کہ مضمون پھر آجاتا تو مرزا ادیب کا جواب تھا کہ نہیں وعدہ کر رکھا تھا۔[۱۵] شخصی زندگی میں وعدے کی پاسداری اور عدم پاسداری ہی انسان کے کھوٹے یا کھرے ہونے کا تعین کرتی ہے۔

مذہب کا تقدس کسی بھی معاشرے میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمان بھی اس معاملے میں کچھ کم حساس نہیں ہیں۔ اس صورتحال میں اس وقت بڑی مشکل پیش آتی ہے جب مذہب سے بالاتر سوچنے کی ضرورت پڑ جائے۔ جو لوگ مذہب کی بنیاد پر سماج میں دوسرے انسانوں کی جان و مال کے دشمن بنتے ہیں، وہ انسان دوستانہ جذبات اور احساسات سے عاری ہوتے ہیں اور اکثر اپنے کسی ذاتی مفاد یا ایجنڈے کے تحت معصوم شہریوں کو قتل کرنے یا لوٹنے کے لیے مذہبی جواز تراشتے ہیں۔ ادب کا تعلق کسی خاص مذہب کے ساتھ نہیں ہے بلکہ انسانیت کے

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05
ماخذ تحقیقی مجلہ

ساتھ ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ایسے مہلک اور جان لیوا حالات پیدا ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں آخری امید مذہبی پیشوا یا سیاستدان نہیں رہتے بلکہ انسانیت کا آخری سہارا ادیب ہی رہ جاتے ہیں۔ سماج میں موجود مذہبی مقررہ یعنی مذہبی تقدس یا کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ وابستگی کے برعکس انسان اور انسانیت کی آواز بلند کرنا ہی حقیقی معنوں میں ادب کی ترجمانی کرنا ہے۔ مصنف کے بقول مرزا ادیب اور ان کے مابین جب ملکی حالات پر گفتگو ہوتی ہے تو چاہے کسی دفتر میں آگ لگا دیے جانے کا واقعہ زیرِ بحث ہو یا مسجد میں۔ دونوں صورتوں میں:

"ہم بغیر رورعایت اور بغیر کسی پارٹی کی طرفداری کے انسان پارٹی کے طرفدار تھے، جو کوئی مر رہا تھا۔ وہ کسی کا باپ تھا۔ بیٹا تھا۔ بھائی تھا۔ اور ان سب سے ہمارا رشتہ تھا۔"[۱۶]

حکومتی حلقوں میں ان ادیبوں کو پذیرائی ملتی ہے جو سرکار کے ساتھ تعلق بنانے اور نبھانے کے ہنر سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایسے ادیب سیاستدانوں، فوجی آمروں اور بیوروکریسی کے اشاروں پر چلتے ہیں یا انہیں خوش کرنے کے گر سے آشنا ہوتے ہیں۔ چاہے اس کے لیے انہیں خوشامد سے کام لینا پڑے۔ یا اخلاق یا معیار سے گری ہوئی حرکات کرنی پڑے۔ اوچھے ہتھکنڈوں کا استعمال مثلاً خوشامد، ضمیر فروشی، حق اور صداقت کا ساتھ دینے کی بجائے مقتدرہ حلقوں کو خوش اور رام کرنے کی کوشش۔۔ یہ ہنر جن ادیبوں کو آتا ہے، مادی اعتبار سے کامیابیاں ان کے قدم چھوتی ہیں۔ ان کو بڑی آسانی کے ساتھ اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ انہیں عہدے دیے جاتے ہیں، فنڈز دیے جاتے ہیں۔ ان کی آواز سنی جاتی ہے۔ وہ ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبارات اور سرکاری اداروں پر چھائے رہتے ہیں۔ برعکس صورت میں جب کوئی ادیب حق اور صداقت کی شمع کو بجھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا اسے کسی وقت تک برداشت تو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کا انجام محرومی پر ہی ہوتا ہے۔ مرزا ادیب بھی کچھ اس قسم کے ادیب تھے۔ مصنف کے بقول مرزا ادیب کا مزاج کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ دوسرے ادیبوں کی طرح اپنا حق بزور منوانے والے، چھین لینے والے اور طنطنے والے نہیں تھے۔ ان کے مزاج میں فطری انکسار موجود تھا۔[۱۷] اگرچہ سماج میں اس قسم کے اعمال کا سکہ عملی طور پر چلتا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت ایسی بھی ہوتی ہے جو درباروں سے وابستگی اور اس کے لیے اثر ورسوخ بنالینے کے لیے لابیز بناتی ہیں اور لابیز کا حصہ بنتی ہیں یا پھر ایسے لوگ ذاتی اور انفرادی طور پر اوچھے ہتھکنڈوں سے کام لے کر حکومتی حلقوں کا رخ اپنی طرف کر لینے کے ہنر سے واقف ہوتے ہیں۔

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

ماخذ تحقیقی مجلہ

سید وقار عظیم:

جس دور سے محمد طفیل کی موضوع شخصیات کا تعلق ہے۔ اس زمانے میں فلم بینی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا اور اس عمل کے خلاف معاشرے میں ایک منفی تاثر موجود تھا۔ وہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ جب ٹیلی وژن دیکھنے کو بھی گناہ سمجھا جاتا تھا اور آج بھی مذہبی حلقوں کی جانب ان کی مخالفت کی جاتی ہے۔ پڑوس میں کوئی مر جاتا تو ٹیلی وژن دیکھنا بند ہو جاتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں بھی ٹیلی وژن کا بائیکاٹ کر دیا جاتا اگرچہ ٹیلی وژن پر رمضان کے خصوصی ٹرانسمیشن چلتے تھے۔ یہ فضا بیسویں صدی کے اختتام تک موجود رہی۔ بالعموم ایسا بھی ہوتا کہ رمضان المبارک میں سینما ہال بند ہو جاتے۔ بہر حال وقار عظیم صاحب پر تحریر کردہ خاکے میں مصنف نے بتایا ہے کہ وقار عظیم کتب بینی اور فلم بینی کے شوقین تھے۔ علی عباس حسینی کے ہمراہ رمضان کے مہینے میں بھی فلم دیکھتے تھے۔ (۱۸) فلم بینی اور رمضان کے مہینے میں ۔۔۔ سماجی اعتبار سے سخت مقررہ ہے۔ جس کی وقار عظیم صاحب زیادہ پرواہ نہ کرتے تھے لیکن سماج میں رمضان کے مہینے میں یہ عمل انتہائی قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔

چھوٹوں کا بڑوں سے بے تکلف ہونا بھی معاشرے میں قابل نفرت سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ اس مقررے کی شدت کمی آرہی ہے اور اس کی حیثیت بھی مشکوک ہونے لگی ہے لیکن بیسویں صدی میں بالخصوص موبائل آنے سے قبل کا دور اس حوالے سے کافی سخت گیر تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض افراد ہر دور میں چھوٹوں کے ساتھ بے تکلف ہوتے رہے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی سماجی مقررہ یہی ہے کہ چھوٹے بڑوں کے ساتھ ادب، تمیز اور احترام کے دائرے کے اندر رہیں گے۔ وقار عظیم صاحب اپنی ذاتی زندگی میں اس مقررے پر سختی کے ساتھ کاربند رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بھائی اقبال عظیم کے بقول میری عمر ان کے مقابلے میں صرف دو سال کم تھی لیکن اس کے باوجود میں ان کے ساتھ بے تکلف نہ ہو سکا۔ وہ ہمیشہ بزرگ بنے رہے۔ (۱۹)

چھوٹوں اور بزرگوں کے مابین فاصلہ ہماری صدیوں کی تہذیب و ثقافت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا مقررہ ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی چھوٹا کسی بزرگ کے ساتھ بدتمیزی کرتا ہے تو ہمارا دل کڑھتا ہے۔ اس فاصلے کو تقویت پہنچانے کے لیے سماج کا یہ ایک اہم مقررہ ہے کہ چھوٹوں کو بڑوں کے سامنے باادب ہونا چاہیے اور جب تک ان سے نہ پوچھا جائے، انہیں خاموش رہنا چاہیے۔

بزرگوں میں سب سے زیادہ قابلِ احترام والدین ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص چاہے کتنا ہی باشعور، امن پسند اور پڑھا لکھا آدمی کیوں نہ ہو، والدین کی عزت کے معاملے میں کافی حساس ہوتا ہے۔ یہی معاملہ

ISSN(P): 2709-9636 | ISSN(O): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

ماخذ تحقیقی مجلہ

سید وقار عظیم کا بھی تھا۔ انہوں نے ایک نوکر رکھا تھا، جو نوکری چھوڑ کر چلا گیا اور قریب کے ایک اور مکان میں ملازمت اختیار کرلی۔ کافی لحیم شحیم اور تنومند آدمی تھا۔ لیکن اس نے وقار عظیم کے والد کی شان میں گستاخی کی۔ وقار عظیم کو پتہ چلا تو اس دبلے پتلے اور کمزور انسان نے لاتوں اور گھونسوں سے اس کی خوب خبر لی۔[۲۰] والدین کی عزت اور ناموس کی خاطر انسان پہاڑ سے بھی ٹکرا جاتا ہے۔

سماجی مقررات کی رو سے منافقت ایک قابل نفرت عمل ہے۔ سماجی مقررات کے مطابق وہ شخص زیادہ قابل قدر ہے جو منافقت سے کام نہیں لیتا۔ اور جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہی اس کی زبان پر بھی ہو۔ منافقت کے حوالے سے مذہبی تعلیمات بھی موجود ہیں۔ قرآن کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کے کئی ایک احادیث منافقت کو قابل نفرت عمل بتاتے ہیں۔ منافقت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان ناقابل اعتبار ٹھہرتا ہے۔ زندگی میں ایسے کئی لوگ ملتے ہیں جو ظاہر میں کچھ دکھائی دیتے ہیں اور اندر سے کچھ ہوتے ہیں۔ ان کے تمام معاملات دوسروں کو نقصان اور خود کو فائدہ دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن کسی دوسرے کے ساتھ وعدے کیے جاتے ہیں اور جب میدان میں بات آتی ہے تو فائدہ دینے کی بجائے نقصان پہنچاتے ہیں۔ سید وقار عظیم کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۴ میں جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار کی اسامی کے لیے انٹرویو دینے گئے تو ان کے مقابلے میں احتشام حسین تھے۔ احتشام حسین کو لیا گیا حالانکہ اس سے قبل مسعود حسن رضوی ادیب جو اس کمیٹی کے صدر تھے۔ اس نے یقین دلا رکھا تھا کہ آپ ضرور منتخب ہوں گے اس لیے کہ یہ آپ کا حق ہے۔[۲۱]

لیکن اسے بعد میں پتہ چلا کہ سیلیکشن کے دوران مخالفت صرف مسعود حسن رضوی ادیب نے کی تھی۔

وقار عظیم کے بقول اس واقعے نے انہیں کافی ذہنی تکلیف سے ہمکنار کیا۔ ان کے بقول انسانیت پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا تھا۔[۲۲]

اگر سید وقار عظیم کو نہ لیا جانا مقصود تھا تو پھر اس کے ساتھ منافقانہ انداز سے وعدہ کرنے اور جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ زندگی میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو بنیادی طور پر اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ پر امن انداز سے زندگی گزاریں اور جیو اور جینے دو کے اصول پر زندگی گزارتے ہیں۔ سید وقار عظیم بھی بنیادی طور پر ہنگاموں سے دور بھاگنے والے انسان تھے۔ مصنف کے بقول وہ ایک با اصول اور پر سکون

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05
ماخذ تحقیقی مجلہ

زندگی گزارنے والے انسان تھے اور جب کسی ہنگامے نے گھر پر دستک دی تو انہوں نے اپنے تدبر سے اس کو ختم کیا اور مقابلے کے لیے نہیں اترے۔[۲۳]

سماج میں بہت سے لوگ مفت کے جھگڑے مول لیتے ہیں اور اپنی توانائیاں ضائع کرتے ہیں۔ کام کرنے والے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ خود کو ایسی منفی سرگرمیوں سے دور رکھتے ہیں اور اپنی تمام توانائیاں زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے یکجا کر دیتے ہیں۔

معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسروں کے احتیاج سے بچا جائے۔ گرد و پیش میں اکثر ایسے لوگ ملتے ہیں جو دوسروں پر بوجھ بنے رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ان کے وسائل کم ہوتے ہیں لیکن ایک تو آمدن کو توازن کے ساتھ خرچ کرنے کے گر سے واقف نہیں ہوتے یا دوسروں کو تکلیف میں رکھنا ان کی فطرت ہوتی ہے۔ اس معاملے میں سید وقار عظیم صاحب کافی متوازن شخصیت رکھتے تھے۔ مصنف کے بقول وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے یہی وجہ تھی کہ کسی سے قرض لینے کی نوبت نہ آئی۔[۲۴]

انسان چاہے کسی بھی عہدے پر ہو لیکن انسانوں کے مابین رہتے ہوئے ان کی خوشیوں اور غمیوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ جو شخص کسی کی غمی اور خوشی میں شریک نہیں ہوتا، اس کے ساتھ معاشرہ قطع تعلق کر لیتا ہے۔ اسے گلی محلے یا دفتر اور ادارے میں اپنائیت نہیں ملتی۔ لوگ اس کے اقتدار کی وجہ سے اس کے محتاج ضرور ہو سکتے ہیں لیکن دل سے اسے پسند نہیں کرتے۔ سید وقار عظیم صاحب اپنے اسٹاف کے ساتھ ان کی زندگیوں میں شریک تھے اور سماجی مقررات کا خیال رکھتے۔ مثلاً مصنف کے بقول اسٹاف کا کوئی ممبر بیمار ہوتا تو وقار عظیم صاحب عیادت کے لیے گھر چلے جاتے۔ کسی رکن کا انتقال ہو جاتا تو تعزیت کے لیے پہنچتے۔ انہوں نے اسٹاف کے ساتھ رویہ گھر والوں کے ساتھ رویے کے مماثل رکھا۔[۲۵]

سید وقار عظیم صاحب کم عمر دوستوں کو بہت زیادہ عزیز رکھتے، ان کی مدد کرتے اور بڑوں کا بے حد احترام کرتے تھے اور حفظِ مراتب کے انتہائی دلدادہ تھے۔[۲۶] پدرسری سماج میں حفظِ مراتب کا انتہائی خیال رکھا جاتا ہے۔ تعلقات اور اٹھک بیٹھک میں بڑوں کا لحاظ رکھنا اور چھوٹوں کے مقابلے میں انہیں ممتاز مقام دینا پدرسری سماج کا ایک اہم مقررہ ہے۔ پدرسری سماج میں عوامی اجتماعات، جشن، جلوس اور غمی اور خوشی کے مواقع پر جب مختلف عمر اور سماجی مرتبے سے تعلق رکھنے والے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، تو عمر اور سماجی اور علمی رتبے کی بنیاد پر فرق

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

ماخذ تحقیقی مجلہ

کرنا انتہائی ناگزیر ہو جاتا ہے تاکہ مستحق کو اس کا جائز مقام ملے۔ اگر بر عکس صورتحال ہو، تو اس کا نتیجہ نفرت اور حقارت اور گلے شکوے کی صورت میں نکلتا ہے۔

بالعموم اداروں میں یہ دیکھنے کو ملا ہے کہ چند با اختیار لوگ مسائل کو حل کرنے کی بجائے اس میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اختیارات کے منفی استعمال کی جہاں کہیں بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے، ایسی صورت میں وہ اپنی افسری جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادارے روبہ زوال ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ان اداروں میں جہاں کہیں بہتری کی خاطر خرچ کرنے کی نوبت آتی ہے، ایسے لوگوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ادارے کا مفاد بے شک بھاڑ میں جائے لیکن ان کے کرپشن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کی گنجائش باقی رہے۔ ایک ایسا ہی واقعہ سید وقار عظیم پر تحریر کردہ خاکے میں درج کیا گیا ہے۔ دفتر ترجمہ و تالیف میں ٹیلی فون کی ضرورت تھی۔ وقار عظیم نے اس کے لیے لکھا اور فنانس کمیٹی نے اس کو بے مصرف فضول خرچی کہہ کر درخواست رد کر دی۔ فنانس کمیٹی نے چائے بسکٹ کا اہتمام اس میٹنگ میں بھی کیا ہوا تھا۔ سید وقار عظیم یہ کہہ کر میٹنگ سے اٹھے کہ اگر ٹیلی فون فضول خرچی کی مد میں آتا ہے تو یہ چائے اور بسکٹ بھی فضول خرچی کی مد میں آتے ہیں۔[۲۷]

ایسے لوگوں کی ذہنیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے اپنے لیے اصول اور قواعد مختلف اور باقی دنیا کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔ بے حسی، منافقت اور ظلم کا یہ انداز سماج میں نظری اعتبار سے کارفرما مقررات کے ساتھ متصادم ہے۔ جس کی روشنی میں ایمانداری، سچائی اور انصاف کا خون ہوتا دیکھ کر انسان کا اخلاقی ردعمل فطری ہے۔

حوالہ جات

1 . https://docmckee.com/oer/soc/sociology-glossary/social-values-definition/#google_vignette
visited on 15th November 2026 time 11:45 am

۲۔ محمد طفیل، مجی۔ لاہور: ادارہ فروغ اردو۔ ۱۹۸۱۔ ص۔ ۲۳

۳۔ میر تقی میر، دیوان اول، مشمولہ کلیات میر، مرتبہ: عبادت بریلوی۔ کراچی: اردو دنیا۔ ۱۹۵۸۔ ص۔ ۱۸۱

۴۔ محمد طفیل، مجی۔ لاہور: ادارہ فروغ اردو۔ ۱۹۸۱۔ ص۔ ۲۶

۵۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۱

۶۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۱

۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۴

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 7, Issue 1, (Jan to Feb 2026)
https://doi.org/10.47205/makhz.2026(7-I)urdu-05

۸۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۶

۹۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۸

۱۰۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۸

۱۱۔ ایضاً۔ ص۔ ۵۳

۱۲۔ ایضاً۔ ص۔ ۵۶

۱۳۔ ایضاً۔ ص۔ ۵۶

۱۴۔ ایضاً۔ ص۔ ۶۲

۱۵۔ ایضاً۔ ص۔ ۶۲

۱۶۔ ایضاً۔ ص۔ ۶۳

۱۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۶۸

۱۸۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۱

۱۹۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۲

۲۰۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۲

۲۱۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۴

۲۲۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۴

۲۳۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۷

۲۴۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۷

۲۵۔ ایضاً۔ ص۔ ۷۸

۲۶۔ ایضاً۔ ص۔ ۸۱

۲۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۸۲